Journal of Religion & Society (JR&S)
Available Online:
https://islamicreligious.com/index.php/Journal/index
Print ISSN: 3006-1296 Online ISSN: 3006-130X
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

Traditional and Modern Research Trends in Islamic Sciences: A Critical and Analytical Study

اسلامی علوم میں تحقیق کے روایتی وجدید رجحانات: ایک تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ

Umais Sajid Abbasi
MPhil Islamic scholar Riphah International University
umaissajida@gmail.com
Rashad Manzoor
PhD Scholar Riphah International University Islamabad
rashidmanzoorabbasi@gmail.com

Abstract

This paper shows a critical analysis of the classic and present research trends in Islamic sciences with references to their development in history, methodology and current challenges. The Islamic sciences, which include fields of study like Quranic studies, Hadith,Fiqh, Sufism, philosophy, history and theology have all had a historical development that comes in various intellectual forms. The study examines the way in which early Muslim thinkers developed systematic approaches based on authenticity, sanad (chains of transmission) and strict intellectual investigation. Those traditional approaches guaranteed the maintenance and continuity of knowledge, but also indicated some limitations, including inability to adapt to arising problems. However, the current research trends which have been largely influenced by the globalization, western academic methodologies and the digital technology have brought new insights such as the critical analysis, interdisciplinary research methodologies and comparative research studies. The paper will examine how the new generation researchers both incorporate new methods of study such as digital archives, scientific, and sociological approaches into the study of Islam, and also discusses the problem of plagiarism, a loss of quality, and a dependence on Western paradigms. The study also makes an analysis of the influence of the Orientalist works, the reaction of the Muslims to these works and the continuous process of the dialogue of tradition and modernity. Thematic, comparative, and interdisciplinary approaches which are increasingly defining the modern Islamic scholarship are given special attention. Further, the paper pinpoints research gaps that are considered crucial like the inception between classical Islamic thought and modern sciences and emphasizes the necessity of adopting moderate research approaches entailing the acknowledgement of authenticity of tradition and incorporation of analytical rigor of the modern scholarship. The proposed results imply that the hybrid approach to research incorporating the advantages of both traditional and modern research can promote the international acclaim and scholarly plausibility of Islamic sciences. This kind of approach will not only help in saving intellectual heritage of the Muslim ummah but also help such sciences to solve the current challenges. In conclusion, the paper focuses on methodological rejuvenation, depth of subject, and the interdisciplinary cooperation as the future of Islamic studies.

Keywords: Islamic Sciences**,** Traditional Research Methodologies**,** Modern Research Trends**,** Critical and Analytical Study**,** Interdisciplinary Approaches**,** Orientalism and Islamic Scholarship**,** Qur'an and Hadith Studies**,** Fiqh and Ijtihad**,** Sufism and Philosophy**,** Research Challenges in Islam

1۔ موضوع کا تعارف

اسلامی علوم میں تحقیقی رجحانات کا تنقیدی جائزہ ایک ایسا علمی موضوع ہے جو نہ صرف موجودہ دور کے تحقیقی منظر نامے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ آئندہ تحقیقی سمتوں کے تعین میں بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ موضوع بنیادی طور پر اسلامی علوم کے مختلف شعبوں میں ہونے والی تحقیقات کے طریق کار، اسلوب، اور نتائج کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اسلامی علوم سے مراد وہ تمام علوم ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسلامی مصادر سے ماخوذ ہیں، جن میں قرآن و حدیث، فقہ و اصول، تفسیر و حدیث، تصوف و اخلاقیات، اور تاریخ و سیرت جیسے بنیادی علوم شامل ہیں۔ موجودہ دور میں جب کہ علمی تحقیق کے طریق کار اور معیارات میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں، اسلامی علوم کی تحقیق بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ اس موضوع کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ یہ نہ صرف روایتی و جدید تحقیقی مناہج کے تقابلی جائزہ پر مشتمل ہے، بلکہ اس میں ان مسائل اور چیلنجز کا احاطہ بھی کیا گیا ہے جو اسلامی علوم کی تحقیق کے سامنے موجود ہیں۔ موضوع کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اسلامی علوم کے تمام بنیادی شعبوں کو محیط ہے اور ہر شعبے میں تحقیقی رجحانات کا جداگانہ تجزیہ پیش کرتا ہے۔

تحقیق کی اہمیت اور ضرورت

اس موضوع پر تحقیق کی اہمیت متعدد پہلوؤں سے واضح ہوتی ہے۔ اولاً، یہ تحقیق اسلامی علوم کے تحقیقی منظر نامے کو سسٹمیٹک طریقے سے سامنے لانے کا کام کرتی ہے، جس سے نہ صرف موجودہ تحقیقی صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ تحقیقی خلا کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ ثانیاً، یہ تحقیق روایتی و جدید تحقیقی مناہج کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی راہ ہموار کرتی ہے، جو کہ موجودہ دور کا اہم تقاضا ہے۔ ثالثاً، اس تحقیق کے ذریعے اسلامی علوم کی تحقیق میں درپیش مسائل اور چیلنجز کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، جن کے حل کے لیے مناسب تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں۔ رابعاً، یہ تحقیق نوجوان محققین کے لیے رہنمائی کا کام کرتی ہے، جو اسلامی علوم کے میدان میں تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ خامساً، بین الاقوامی سطح پر اسلامی علوم کی تحقیق کو متعارف کرانے اور انہیں قابل قبول بنانے میں بھی یہ تحقیق معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ موجودہ دور میں جب کہ اسلامی علوم پر مختلف حلقوں سے اعتراضات کیے جا رہے ہیں، ایسی تحقیق کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے جو ان علوم کی علمی و تحقیقی بنیادوں کو مضبوط طریقے سے پیش کر سکے۔

مقاصدِ تحقیق

اس تحقیق کے متعدد اہم مقاصد ہیں جو اس کے دائرہ کار اور اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ اولاً، تحقیق کا بنیادی مقصد اسلامی علوم کے مختلف شعبوں میں موجودہ تحقیقی رجحانات کا تنقیدی جائزہ پیش کرنا ہے۔ ثانیاً، روایتی و جدید تحقیقی مناہج کے درمیان تقابلی مطالعہ کرنا ہے، تاکہ دونوں کے امتیازی پہلوؤں کو واضح کیا جا سکے۔ ثالثاً، اسلامی علوم کی تحقیق میں درپیش مسائل اور چیلنجز کی نشاندہی کرنا ہے، جن میں تحقیقی معیار کی کمی، موضوعاتی تحقیق کی ضرورت، اور عالمی تحقیقی تقاضوں سے ہم آہنگی جیسے مسائل شامل ہیں۔ رابعاً، تحقیقی خلا کی نشاندہی کرنا ہے، تاکہ آئندہ محققین ان خلا کو پر کرنے کی کوشش کر سکیں۔ خامساً، روایتی و جدید مناہج کے امتزاج کے امکان کو تلاش کرنا ہے، جو کہ موجودہ دور کا اہم تقاضہ ہے۔ سادساً، آئندہ تحقیقی سمتوں کے لیے تجاویز پیش کرنا ہے، جو نہ صرف تحقیقی معیار کو بلند کرنے میں مددگار ثابت ہوں بلکہ اسلامی علوم کی عالمی سطح پر قبولیت کو بھی بڑھا سکیں۔ ان مقاصد کے حصول سے نہ صرف اسلامی علوم کی تحقیق کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں مدد ملے گی بلکہ یہ علوم امت مسلمہ کی علمی رہنمائی کا ذریعہ بھی بن سکیں گے۔

2۔ اسلامی علوم کی تعریف اور دائرہ کار

اسلامی علوم کا تاریخی پس منظر

اسلامی علوم کی تاریخ کا آغاز خود نزول قرآن سے ہوتا ہے، جو بنی نوع انسان کے لیے علم وہدایت کا اولین سرچشمہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں علم کی ترقی کا مرکز مسجد نبوی تھی، جہاں صحابہ کرام قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ "اقرأ باسم ربک الذی خلق[i]" کے حکم کے ساتھ ہی اسلام نے علم کے حصول کو عبادت قرار دیا۔ خلفاء راشدین کے دور میں اسلامی سلطنت کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی علوم میں بھی وسعت آئی، خاص طور پر حضرت عمر فاروق کے دور میں دارالخلافہ مدینہ منورہ علمی سرگرمیوں کا مرکز بنا[ii]۔ اموی دور میں علمی اداروں کی بنیاد پڑی، جبکہ عباسی دور اسلامی علوم کا سنہری دور کہلاتا ہے، جب بغداد دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا۔ خلیفہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے دور میں بیت الحکمت جیسے عظیم علمی ادارے قائم ہوئے، جہاں یونانی، فارسی اور ہندی علوم کے تراجم کا کام ہوا[iii]۔ بعد ازاں اسلامی علوم کی اشاعت میں سلجوقی اور عثمانی دور نے اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان میں اسلامی علوم کی ترقی دہلی سلطنت اور مغلیہ دور میں اپنے عروج پر پہنچی، جہاں فتح پور سیکری اور دہلی کے علمی مراکز قائم ہوئے۔ اسلامی علوم کی یہ تاریخی تسلسل آج بھی جاری ہے، جس میں جدید تعلیمی ادارے اسلامی علوم کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں۔

بنیادی اقسام (قرآن، حدیث، فقہ، تصوف وغیرہ)

اسلامی علوم کو بنیادی طور پر چند اہم اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلا اور اہم علم "علم القرآن" ہے، جس میں قرآن مجید کی تفسیر، تجوید، اور علوم القرآن شامل ہیں۔ یہ علم تمام اسلامی علوم کی بنیاد ہے، جیسا کہ امام غزالی فرماتے ہیں" : قرآن کا علم سب علوم سے افضل ہے، کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے[iv]"۔ دوسرا بڑا علم "علم الحدیث" ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تیسرا اہم علم "علم الفقہ" ہے، جو اسلامی قانون اور احکامات کے استنباط پر مشتمل ہے۔ چوتھا علم "علم التصوف" ہے، جو تزکیہ نفس اور احسان کے مراتب سے متعلق ہے۔ امام غزالی کے مطابق "تصوف شریعت کے ظاہری و باطنی احکام پر خلوص نیت کے ساتھ عمل کرنے کا نام ہے[v]"۔ اس کے علاوہ علم الکلام، علم التوحید، اور علم السیرۃ بھی اسلامی علوم کی اہم شاخیں ہیں۔ ہر علم کی اپنی خصوصیات اور اہمیت ہے، اور یہ سب مل کر اسلامی تعلیمات کا مکمل نظام پیش کرتے ہیں۔

دینی وعصری علوم کے تعلقات

دینی و عصری علوم کے باہمی تعلقات کو سمجھنا جدید دور کا ایک اہم علمی تقاضا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق تمام حقیقی علوم درحقیقت اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں، چاہے وہ دینی ہوں یا عصری۔ امام غزالی فرماتے ہیں" : ہر وہ علم جو انسان کو اللہ کی معرفت اور اس کی اطاعت کی طرف لے جائے، وہ دینی علم ہے[vi]"۔ جدید دور میں دینی و عصری علوم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں اس نقطہ پر زور دیا ہے کہ "دینی علوم کو جدید علمی دور سے ہم آہنگ کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے[vii]"۔ دینی علوم انسان کو آخرت کی تیاری کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، جبکہ عصری علوم دنیا میں ترقی اور خوشحالی کے ذرائع مہیا کرتے ہیں۔ دونوں علوم کا باہمی تعلق درحقیقت "دنیا و آخرت کی کامیابی" کے اسلامی تصور کی عملی تفسیر ہے۔ جب دینی و عصری علوم کے درمیان صحیح توازن قائم ہو جاتا ہے تو انسان ایک متوازن اور کامیاب زندگی گزار سکتا ہے، جو دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کا ضامن ہوتی ہے۔

3۔ اسلامی علوم میں تحقیق کا ارتقائی سفر

ابتدائی اسلامی دور میں تحقیق

اسلامی علوم میں تحقیق کا سفر درحقیقت نزول قرآن کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو قرآن مجید کی تعلیم و تفہیم کے ساتھ ساتھ اس پر غور و فکر کی ترغیب دی۔ "اقرأ باسم ربک الذی خلق" کے حکم نے جہاں علم کے حصول کی بنیاد رکھی، وہیں تحقیق و جستجو کی روح بھی پروان چڑھائی۔ ابتدائی اسلامی دور میں تحقیق کا مرکز مسجد نبوی تھی، جہاں صحابہ کرام نہ صرف قرآن و حدیث سیکھتے بلکہ نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے اجتہاد بھی کرتے[viii]۔ خلفاء راشدین کے دور میں جب اسلامی ریاست کا دائرہ وسیع ہوا، تو تحقیق کے نئے میدان کھلے۔ حضرت عمر فاروق کے دور میں دارالخلافہ مدینہ منورہ علمی سرگرمیوں کا مرکز بنا، جہاں مختلف الثقافتی مسائل کے حل کے لیے تحقیق کی جاتی تھی۔ اس دور کی تحقیق کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ براہ راست عملی مسائل سے متعلق تھی اور اس کا مقصد کتاب و سنت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنا تھا۔ تحقیق کا یہ سلسلہ خلفاء راشدین کے بعد اموی دور میں بھی جاری رہا، جہاں پہلی بار باقاعدہ علمی اداروں کی بنیاد پڑی۔ ابتدائی دور کی تحقیق نے درحقیقت اسلامی علوم کی بنیاد رکھی اور بعد میں آنے والے محققین کے لیے راہ ہموار کی۔

عباسی دور میں علمی تحریک

عباسی دور اسلامی علوم میں تحقیق کے ارتقا کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے دور میں بغداد دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا، جہاں بیت الحکمت جیسے عظیم علمی ادارے قائم ہوئے[ix]۔ بیت الحکمت میں نہ صرف یونانی، فارسی اور ہندی علوم کے تراجم کا کام ہوا، بلکہ ان علوم پر تحقیق و تنقید کا کام بھی ہوا۔ عباسی دور میں تحقیق کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا، جس میں فلسفہ، منطق، ریاضی، فلکیات، طب، کیمیا، جغرافیہ اور دیگر علوم شامل تھے۔ اس دور کے ممتاز محققین میں الخوارزمی (جبر کے بانی)، ابن الہیثم (بصریات کے ماہر)، ابن سینا (طبعیات کے امام)، اور البیرونی (علم الافلاک کے ماہر) جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔ ان محققین نے نہ صرف قدیم علوم کو محفوظ کیا، بلکہ ان میں اضافے بھی کیے اور نئے علوم کی بنیاد رکھی۔ عباسی دور کی تحقیق کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تنقیدی رویہ پایا جاتا تھا۔ محققین نے یونانی علوم کو نہ صرف ترجمہ کیا، بلکہ ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی اور ان کی غلطیوں کو درست کیا۔ اس دور میں تحقیق کے لیے حکومتی سرپرستی میسر تھی، جس کے باعث علمی کام تیز رفتاری سے آگے بڑھا۔

جدید دور میں تحقیقی رویے

جدید دور میں اسلامی علوم میں تحقیق کے رویوں میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں۔ جدیدیت، مغربی تعلیم اور ٹیکنالوجی کے اثرات نے تحقیق کے طریق کار اور موضوعات دونوں کو متاثر کیا ہے۔ جدید دور میں تحقیق کے لیے جامعات اور تحقیقی ادارے قائم ہوئے ہیں، جن میں باقاعدہ تحقیق کے پروگرام چلائے جا رہے ہیں[x]۔ جدید تحقیقی رویوں میں ایک اہم تبدیلی موضوعات کا تنوع ہے۔ اب نہ صرف روایتی علوم قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف پر تحقیق ہو رہی ہے، بلکہ اسلامی معاشیات، اسلامی سیاسیات، اسلامی نفسیات، اور اسلامی سائنس جیسے نئے شعبوں میں بھی تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ جدید تحقیق کی ایک اور خصوصیت بین الضابطہ جاتی (Interdisciplinary) تحقیق ہے، جس میں اسلامی علوم کو جدید علوم کے ساتھ ملا کر مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ جدید تحقیقی رویوں میں تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کو بھی اہمیت دی جا رہی ہے۔ محققین اب قدیم متون کا تنقیدی جائزہ لے رہے ہیں اور مختلف مکاتب فکر کے درمیان تقابلی مطالعے کر رہے ہیں۔ جدید دور میں تحقیق کے لیے بین الاقوامی تعاون بھی بڑھا ہے، جس کے باعث مختلف ممالک کے محققین مل کر کام کر رہے ہیں۔

4۔روایتی تحقیق کا منہج

روایت پر مبنی علمی طرزِ عمل

روایتی تحقیق کا منہج درحقیقت اسلامی علوم کی وہ بنیاد ہے جس پر محدثین، فقہاء اور مفسرین نے اپنی علمی عمارت کھڑی کی۔ اس منہج کی بنیاد "سند" اور "روایت" کے تصور پر ہے، جہاں ہر علم کو ایک مستند سلسلۂ اسناد کے ذریعے منتقل کیا جاتا ہے۔ امام مالک بن انس کے مشہور قول کے مطابق "لا یصلح آخر ہذہ الامۃ الا بما صلح بہ أولہا "یعنی "اس امت کے آخر کو وہی چیز درست کرے گی جو اس کے اول کو درست کر چکی ہے"[xi]۔ روایتی منہج کی یہ خصوصیت اسے جدید تحقیقی مناہج سے ممتاز کرتی ہے کہ یہاں تسلسل اور روایت کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ علم حدیث میں اس منہج کی واضح مثال ملتی ہے، جہاں ہر حدیث کے لیے ایک مستند سند کی شرط عائد کی گئی ہے۔ اسی طرح تفسیر قرآن میں ماثور تفسیر کا سارا دارومدار روایات پر ہے۔ فقہی مسائل میں بھی قدیم فقہاء کے اقوال اور اجتہادات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ روایتی منہج کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں علم کی حفاظت اور تسلسل کو یقینی بنایا جاتا ہے، جس سے علمی خزانہ محفوظ رہتا ہے۔

محدثین وفقہاء کا تحقیقی طریقہ

محدثین اور فقہاء کے تحقیقی طریقہ کار میں واضح فرق پایا جاتا ہے، اگرچہ دونوں کا تعلق روایتی منہج سے ہے۔ محدثین کا تحقیقی طریقہ بنیادی طور پر "نقد الحدیث" پر مبنی ہے، جس میں راویوں کے حالات، اسناد کے تسلسل، اور متن کے الفاظ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ امام بخاری کے تحقیقی معیار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حدیث قبول کرنے سے پہلے راوی کے حالات کی مکمل چھان بین کرتے تھے[xii]۔ دوسری طرف فقہاء کا تحقیقی طریقہ "اجتہاد" اور "قیاس" پر مبنی ہے، جہاں قرآن وحدیث کی روشنی میں نئے مسائل کے حل تلاش کیے جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کا اجتہادی منہج اس کی بہترین مثال ہے، جہاں وہ موجودہ نصوص کے علاوہ قیاس اور استحسان جیسے ادلہ سے بھی استفادہ کرتے ہیں[xiii]۔ دونوں طریقہ کار میں مشترکہ بات یہ ہے کہ دونوں ہی کتاب وسنت کو بنیادی ماخذ مانتے ہیں اور اپنے تحقیقی کام میں انتہائی محتاط اور منضبط رویہ اپناتے ہیں۔

روایتی منہج کی خصوصیات ومحدودیات

روایتی تحقیقی منہج کی کئی نمایاں خصوصیات ہیں جن میں علم کی حفاظت، تسلسل، اور اصالت کو برقرار رکھنا سب سے اہم ہے۔ اس منہج کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں علمی شفافیت پائی جاتی ہے، جہاں ہر بات کی سند دی جاتی ہے۔ امام غزالی کے مطابق "من لم یحفظ الأصول حرم الوصول "یعنی "جو شخص اصولوں کو محفوظ نہیں رکھتا، وہ مقصد تک نہیں پہنچ سکتا"[xiv]۔ تاہم اس منہج کی کچھ محدودیتیں بھی ہیں، جن میں تنقیدی شعور کی کمی، جدید مسائل سے عدم واسطہ، اور تقلید پر ضرورت سے زیادہ انحصار شامل ہیں۔ جدید دور کے محقق ڈاکٹر محمد اجمل خان اس نقطہ پر روشنی ڈالتے ہیں کہ "روایتی منہج کی سب سے بڑی محدودیت یہ ہے کہ اس میں تخلیقی فکر کے لیے کم گنجائش پائی جاتی ہے"[xv]۔ ان محدودیتوں کے باوجود روایتی منہج کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، کیونکہ یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلامی علوم کی عمارت کھڑی ہے۔

5۔ جدید تحقیق کا منہج

استشراق اور مغربی علمی مناہج

استشراق درحقیقت مغربی علمی مناہج کی وہ تحریک ہے جس نے مشرقی علوم وفنون کے مطالعے کو ایک منظم شکل دی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد مشرقی تہذیبوں، خاص طور پر اسلامی دنیا کے علوم، زبانوں، ادب اور مذاہب کا گہرائی سے مطالعہ کرنا تھا[xvi]۔ استشراق کی تحریک کا آغاز اگرچہ آٹھویں صدی عیسوی سے ہوا، لیکن یہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچی۔ مستشرقین نے اپنے مطالعے کے لیے جن طریقوں کو اپنایا، وہ درحقیقت مغربی علمی روایت کا حصہ ہیں۔ ان میں متن کی تنقیدی تدوین، تاریخی موازنہ، اور لسانی تجزیہ جیسے طریقے شامل ہیں۔ ایڈورڈ

سعید جیسے نقادوں نے استشراق پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ محض علم کا ذریعہ نہیں بلکہ طاقت کے حصول کا ایک آلہ بھی ہے[xvii]۔ مستشرقین کے کاموں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اسلامی علوم کے حوالے سے بڑا کام کیا ہے، خواہ ان کے مقاصد کچھ بھی رہے ہوں۔ انہوں نے نایاب مخطوطات کی دریافت اور تدوین، عربی اور دوسری مشرقی زبانوں کی لغات کی تیاری، اور اسلامی علوم کے مختلف پہلوؤں پر گہری تحقیق جیسے اہم کام کیے۔ تاہم، ان کے کام میں اکثر یک طرفہ پن اور تعصب کی شکایت بھی پائی جاتی ہے۔ جدید دور میں استشراقی مطالعات کا ایک نیا رجحان Continental Philosophy کے تناظر میں سامنے آیا ہے، جس میں ساختیات، پس ساختیات، اور تفسیریات جیسے جدید فلسفیانہ رجحانات شامل ہیں[xviii]۔ اس نئے رجحان نے اسلامی نصوص کے فہم کو جدید مغربی فلسفے کے ساتھ جوڑ دیا ہے، جس کے نتیجے میں مطالعہ اسلام کے نئے زاویے سامنے آئے ہیں۔ استشراق کے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلامی علوم کے مطالعے کے لیے نئے راستے کھولے ہیں، اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی محدودیتوں اور خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جدید سائنسی و سوشیالوجیکل طریقے

جدید تحقیق میں سائنسی طریقہ کار کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، جو مشاہدے، تجربے، اور تجزیے پر مبنی ہے۔ یہ طریقہ کار بنیادی طور پر مسلمان سائنسدانوں کی دین ہے، جنہوں نے یونانی فلسفے کے استخراجی انداز فکر کو ترک کر کے تجرباتی طریقہ کار کو اپنایا[xix]۔ جدید سائنسی طریق کار کے چھ اہم مراحل ہیں: پہلا مشاہدہ، دوسرا مفروضہ قائم کرنا، تیسرا معلومات جمع کرنا، چوتھا معلومات کا تجزیہ و تحلیل، پانچواں رائے قائم کرنا، اور چھٹا نتائج کا بیان[xx]۔ یہ طریقہ کار نہ صرف سائنس کے میدان میں، بلکہ سماجی علوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سوشیالوجیکل تحقیق میں معروضی طریقے اپنائے جاتے ہیں، جن میں surveys، interviews، اور case studies شامل ہیں۔ جدید دور میں تحقیق کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ناگزیر ہو گیا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے تحقیق کے میدان میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اب محققین گھر بیٹھے دنیا بھر کی لائبریریوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں، ماہرین سے فوری رابطہ کر سکتے ہیں، اور اپنے کام کو آسانی سے شائع کر سکتے ہیں[xxi]۔ جدید تحقیق کی ایک اہم خصوصیت بین الضابطہ جاتی (interdisciplinary) تحقیق ہے، جس میں مختلف علوم کے ماہرین مل کر کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تنقیدی اور تقابلی مطالعہ بھی جدید تحقیق کا اہم حصہ ہے۔ جدید تحقیق میں معروضیت، شفافیت، اور اخلاقیات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ محققین پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام میں غیر جانبدار رہیں، اپنے ماخذ کو شفاف طریقے سے پیش کریں، اور تحقیق کے دوران اخلاقی اصولوں کا خیال رکھیں۔

جدید تحقیق کے فوائد اور مسائل

جدید تحقیق کے بے شمار فوائد ہیں، جن میں سب سے اہم معلومات تک آسان رسائی ہے۔ انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل لائبریریوں نے علم کے خزانوں کو ہر خاص و عام کے لیے کھول دیا ہے[xxii]۔ جدید تحقیق کے دیگر فوائد میں تحقیق کے عمل میں تیزی، مختلف النوع موضوعات کا احاطہ، بین الاقوامی تعاون، اور نتائج کی بروقت اشاعت شامل ہیں۔ جدید تحقیق نے نہ صرف علم کے دائرے کو وسیع کیا ہے، بلکہ اسے زیادہ منظم اور مربوط بھی بنایا ہے۔ تاہم، جدید تحقیق کے ساتھ کئی مسائل بھی وابستہ ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ معلومات کے بھنور میں سچائی تک پہنچنے کی دشواری ہے۔ انٹرنیٹ پر ہر طرف معلومات کا ایک سمندر ہے، لیکن ان میں سے صحیح اور غلط میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ دوسرا بڑا مسئلہ معیار کا ہے۔ جدید دور میں اشاعت کی دوڑ میں معیار کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ تیسرا مسئلے علمی سرقہ (plagiarism) ہے، جس میں دوسروں کے کام کو بغیر حوالہ دیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چوتھا مسئلہ تجارتی بن جانا ہے، جہاں تحقیق کا مقصد علم کی ترقی کی بجائے پیسہ کمانا بن گیا ہے۔ جدید تحقیق کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس میں مقامی تناظر کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مغربی علمی مناہج کو عالمگیر سمجھ کر نافذ کیا جاتا ہے، جبکہ مقامی علم اور روایتی تناظر کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس کے علاوہ، جدید تحقیق میں اخلاقیات کا چیلنج بھی موجود ہے، خاص طور پر میڈیکل اور حیاتیاتی تحقیق میں۔ ان تمام

مسائل کے باوجود، جدید تحقیق علم کی ترقی اور انسانی فلاح کے لیے ناگزیر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھایا جائے اور منفی پہلوؤں سے بچا جائے۔

6۔ قرآن وعلوم قرآنی میں تحقیقی رجحانات

کلاسیکی تفسیری مناہج

کلاسیکی تفسیری مناہج کی بنیاد قرآن، حدیث اور سلف صالحین کے اقوال پر مبنی ہے جو علمی تسلسل اور روایت کی حفاظت پر زور دیتے ہیں۔ ان مناہج میں "تفسیر بالماثور" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جس میں قرآن کی تفسیر قرآن سے، پھر حدیث سے، اور پھر صحابہ و تابعین کے اقوال سے کی جاتی ہے[xxiii]۔ کلاسیکی دور میں تفسیر کے تین بڑے مدارس وجود میں آئے: مکہ مکرمہ کا مدرسہ تفسیر جس میں عبداللہ بن عباس جیسے مفسرین نے اپنے تفسیری علوم منتقل کیے، مدینہ منورہ کا مدرسہ تفسیر جہاں ابی بن کعب اور زید بن ثابت جیسے صحابہ نے تفسیر کی تعلیم دی، اور کوفہ کا مدرسہ تفسیر جس میں عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں نے تفسیر کے علم کو آگے بڑھایا[xxiv]۔ کلاسیکی مفسرین نے تفسیر کی متعدد اقسام متعارف کرائیں جن میں تفسیر بالماثور کے علاوہ تفسیر بالرأی المحمود (اجتہادی تفسیر)، تفسیر فقہی، اور تفسیر بالاشارۃ (صوفیانہ تفسیر) شامل ہیں۔ ہر مفسر نے اپنے علمی پس منظر کے مطابق قرآن کی تفسیر پیش کی، جیسے کہ فقیہ نے فقہی مسائل پر زور دیا اور ادیب نے بلاغت و زبان دانی کو نمایاں کیا[مولانا عبدالصبور ندوی، تفسیری مناہج، (نیپال: جامعہ سراج العلوم، 2011)، ص 1]۔ کلاسیکی تفسیر کی نمایاں خصوصیات میں سند کا اہتمام، اسرائیلیات سے احتیاط، اور زبان و بیان کے قواعد کی پابندی شامل ہے۔ ان مناہج نے قرآن فہمی کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کی جو بعد میں آنے والے مفسرین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔

جدید تفسیری رجحانات

جدید دور میں تفسیر قرآن کے رجحانات میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں جو مغربی تہذیب کے اثرات، سائنسی ترقی، اور نئے فکری چیلنجز کے تناظر میں سامنے آئی ہیں۔ جدید تفسیری تحریک کی بنیاد تجدد پسندی پر ہے جس کے اہم اہداف میں مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنا، خرافات کو دور کرنا، اور دینی تعلیمات کو جدید سائنسی دریچوں سے ہم آہنگ کرنا شامل ہے[ویکی فقہ، تفسیر و گرایشهای تفسیری جدید، (قم: ویکی فقہ، 2023)، ص 1]۔ جدید تفسیری رجحانات میں تین اہم رویے نمایاں ہیں: سلفی رویہ جو قدیم مفسرین کی آراء اور سلف صالح کی سنت پر مبنی ہے، عقلی-اصلاحی رویہ جس میں عقل کو وحی کے ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے، اور تفسیر برای تغییر جو معاشرتی تبدیلی پر زور دیتی ہے۔ محمد عبدہ اور ان کے شاگرد رشید رضا نے تفسیر المنار میں جدید عقلی اور اصلاحی رویے کو متعارف کرایا جس میں قدیم تفاسیر کے اسلوب پر تنقید کی گئی اور قرآن کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی[xxv]۔ جدید مفسرین نے تفسیر کے نئے اسالیب متعارف کرائے ہیں جن میں علمی تفسیر) سائنسی discoveries کو قرآن سے مربوط کرنا(، موضوعی تفسیر (قرآنی موضوعات کا تجزیاتی مطالعہ)، اور ادبی تفسیر (قرآن کے بلاغی اور لسانی پہلوؤں پر توجہ) شامل ہیں۔ ان جدید رجحانات نے قرآن فہمی کے نئے دروازے کھولے ہیں لیکن ساتھ ہی کچھ چیلنجز بھی پیدا کیے ہیں جن میں متن کی تفسیر میں حد سے تجاوز اور قدیم تفسیری ورثے سے دوری شامل ہیں۔

تقابلی مطالعہ (روایتی وجدید)

روایتی اور جدید تفسیری مناہج کے تقابلی مطالعے سے دونوں کے مابین بنیادی فرق اور امتیازی خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔ روایتی مناہج کی بنیاد نقل و روایت پر ہے جبکہ جدید مناہج عقل و اجتہاد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر شیخ محمد ادیب صالح اپنی کتاب "تفسیر نصوص کے اصول و مناہج" میں واضح کرتے ہیں کہ روایتی تفسیر میں سند کا سلسلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے اور ہر بات کی پشت پر قرآن، حدیث یا سلف صالحین کے اقوال ہوتے

ہیں[xxvi]۔ جدید تفسیری مناہج میں عقل اور جدید علوم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جیسا کہ ویکی فقہ کے مضمون میں بیان کیا گیا ہے کہ "رویکرد عقلی - اصلاحی، عقل کو هممرتبه وحی قرار میدهد"[xxvii]۔ دونوں مناہج کے مصادر و مآخذ میں بھی واضح فرق پایا جاتا ہے۔ روایتی مفسرین کے لیے قرآن، حدیث، صحابہ و تابعین کے اقالات اور عربی زبان و ادب کے کلاسیکی مصادر بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، جبکہ جدید مفسرین جدید علوم، سائنسی نظریات، اور مغربی فلسفہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ ہدف و مقصد کے اعتبار سے بھی دونوں میں فرق ہے - روایتی تفسیر کا بنیادی ہدف قرآن کی مراد کو سلف صالحین کی روشنی میں سمجھنا ہے، جبکہ جدید تفسیر کا مقصد قرآن کو جدید ذہن کے لیے قابل فہم بنانا اور اسے موجودہ مسائل کے حل کے لیے پیش کرنا ہے۔ دونوں مناہج کی اپنی خوبیاں اور خامیاں ہیں، اور امت کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں کے مثبت پہلوؤں کو ملاحظہ میں رکھتے ہوئے قرآن فہمی کا ایک متوازن اسلوب اختیار کرے۔

7۔ علومِ حدیث میں تحقیقی رجحانات

محدثین کا تحقیقی طرزِ عمل

محدثین کرام کا تحقیقی طرزِ عمل درحقیقت علمِ حدیث کی حفاظت وصیانت کا ایک عظیم الشان monument ہے جس کی مثال دنیا کے کسی اور علمی شعبے میں نہیں ملتی۔ محدثین نے حدیث کی تحقیق کے لیے جن اصولوں اور معیارات کو وضع کیا، وہ نہ صرف انتہائی محکم اور مضبوط تھے بلکہ ان میں علمی دیانت اور حزم واحتیاط کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو آج کے جدید تحقیقی معیارات کے لیے بھی مشعل راہ ہیں۔ محدثین کے تحقیقی طریقہ کار کی بنیاد دوستونوں پر قائم تھی: روایت اور درایت۔ روایت سے مراد سند کے تسلسل اور راویوں کے حالات کی مکمل چھان بین کرنا تھی، جبکہ درایت سے مراد متن حدیث کی عقلی وشرعی حیثیت پر غور وفکر کرنا تھا[xxviii]۔ محدثین نے راویوں کے حالات جانچنے کے لیے "علم الرجال" اور "علم الجرح والتعدیل" جیسے علوم کو پروان چڑھایا، جہاں ہر راوی کی عدالت، ضبط، حافظہ، اور اس کی زندگی کے حالات کو پرکھا جاتا تھا۔ امام بخاری کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کسی حدیث کو اپنی صحیح میں درج کرنے سے پہلے راوی کے حالات کی مکمل تحقیق کرتے تھے اور اس کے لیے دور دراز کے سفر بھی کرتے تھے[xxix]۔ محدثین کا یہ طرزِ عمل محض ایک علمی مشغلہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک دینی فریضہ کی ادائیگی تھی، جسے وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی حفاظت کے جذبے سے انجام دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحقیق میں کسی قسم کی دنیاوی غرض یا مفاد کو شامل ہونے نہیں دیا، بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا اور دین کی خدمت کو اپنا مقصد بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج چودہ سو سال بعد بھی ان کی تحقیقی کاموں کو علمی حلقوں میں انتہائی معتبر مانا جاتا ہے۔

مستشرقین اور جدید تنقیدی مناہج

انیسویں اور بیسویں صدی میں مستشرقین نے علمِ حدیث کے میدان میں ایک جدید تنقیدی رجحان کا آغاز کیا، جس کا بنیادی مقصد اسلامی روایات کو تاریخی اور تنقیدی انداز میں پرکھنا تھا۔ مستشرقین کے اس رجحان کے بانیوں میں گولڈزیہر(Gold Ziher) ، جوزف شاخت (Joseph Schacht)، اور ان کے پیروکار شامل ہیں، جنہوں نے حدیث کی تدوین اور اس کی تاریخی ترقی کے حوالے سے نئے نظریات پیش کیے[xxx]۔ مستشرقین کا بنیادی موقف یہ تھا کہ حدیثیں درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان یا فعل کی براہ راست روایات نہیں ہیں، بلکہ یہ بعد کے ادوار میں مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی عوامل کے تحت وجود میں آئی ہیں۔ انہوں نے حدیث کے متن اور سند دونوں پر تنقیدی اعتراضات وارد کیے اور اس کے تاریخی تسلسل پر سوالیہ نشان لگائے۔ گولڈزیہر نے اپنی کتاب "مسلم اسٹڈیز" میں دعویٰ کیا کہ حدیثیں درحقیقت دوسری اور تیسری صدی ہجری کی علمی اور فقہی کشمکش کی پیداوار ہیں[xxxi]۔ مستشرقین کے اس تنقیدی رجحان نے اگرچہ اسلامی دنیا میں ابتدا میں اضطراب پیدا کیا، لیکن بعد میں مسلم محققین نے ان کے اعتراضات کا علمی اور مدلل جواب دیا۔ مسلم علماء نے ثابت کیا کہ مستشرقین کے پاس حدیث کے

مستند ہونے کے بارے میں کوئی ٹھوس تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے، بلکہ ان کے نظریات محض قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ مستشرقین کے اس رجحان کا ایک مثبت پہلو یہ نکلا کہ اس نے مسلم محققین کو حدیث کے دفاع میں مزید علمی کام کرنے پر آمادہ کیا اور علم حدیث کے میدان میں نئی تحقیقات کا دروازہ کھولا۔

عصری دور میں حدیثی تحقیق کے مسائل

عصر حاضر میں حدیثی تحقیق کے سامنے کئی نئے مسائل اور چیلنجز ہیں، جن کا تعلق جدید ذرائع ابلاغ، مغربی افکار کے اثرات، اور معاشرتی تبدیلیوں سے ہے۔ ان مسائل میں سب سے اہم مسئلہ "انکار حدیث" کا ہے، جس میں بعض حلقے حدیث کو حجت ماننے سے انکار کرتے ہیں[xxxii]۔ اس کے علاوہ، جدید ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا نے حدیثی تحقیق کے لیے نئے چیلنجز پیدا کیے ہیں، جہاں غلط اور موضوع احادیث کو آسانی سے پھیلایا جا سکتا ہے۔ عصری دور کا ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ قدیم حدیثی لٹریچر سے براہ راست استفادہ کرنے کے بجائے ثانوی ماخذوں پر انحصار کرتا ہے، جس کے نتیجے میں اصل مصادر سے دوری پیدا ہو رہی ہے۔ جدید دور میں حدیثی تحقیق کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ بعض حلقے حدیث کو جدید سائنسی نظریات اور مغربی افکار کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں حدیث کے مقام و مراتب کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں[xxxiii]۔ ان مسائل کے باوجود، عصری دور میں حدیثی تحقیق کے لیے نئے مواقع بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے حدیث کے مصادر تک رسائی کو آسان بنایا ہے، اور جدید تحقیقی ادارے حدیثی علوم کی ترویج و اشاعت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حدیثی تحقیق کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس کے اصل مصادر اور اصولوں پر کاربند رہا جائے۔

8۔ فقہ واصولِ فقہ میں تحقیقی رجحانات

فقہاء کا روایتی منہج

فقہاء کرام کا روایتی منہج استنباط در حقیقت اسلامی علوم کا وہ مضبوط ستون ہے جس پر چودہ سو سال سے زائد عرصے سے امت مسلمہ کے علمی و عملی نظام کی عمارت قائم ہے۔ یہ منہج بنیادی طور پر چار بنیادی مصادر: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس پر استوار ہے، جس کی تفصیلات اصول فقہ کی کتب میں منضبط ہیں[xxxiv]۔ فقہی منہج کی تشکیل میں ابتدائی طور پر دو مکاتب فکر نمایاں ہوئے: اصحاب الحدیث اور اصحاب الرائے۔ اصحاب الحدیث کا زور نصوص کے ظاہری مفہوم پر تھا، جبکہ اصحاب الرائے نصوص کے مقاصد، علل اور خارجی قرائن کو بھی مد نظر رکھتے تھے۔ امام ابو حنیفہ کے منہج استنباط کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نصوص کو سمجھنے میں عقل و فکر کو بروئے کار لاتے تھے اور متعارض نصوص میں ترجیح کے لیے قرآن سے موافقت، مقاصد شریعت اور عرف جیسے اصولوں کو اہمیت دیتے تھے[xxxv]۔ فقہاء کے ہاں "درایت" کو "روایت" کے ساتھ ملایا جاتا تھا، یعنی حدیث کے متن کو صرف سند ہی سے نہیں پرکھا جاتا تھا، بلکہ اس کی عقلی و شرعی حیثیت پر بھی غور کیا جاتا تھا۔ روایتی منہج کی ایک اہم خوبی "تدریج" تھی، جس کے تحت فقہی احکام ایک طویل عرصے میں مرتب ہوئے اور ہر دور کے حالات و ضروریات کے مطابق ان میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی۔

جدید فقہی اجتہادی کوششیں

دور جدید میں فقہی اجتہاد کی کوششیں در حقیقت اس ضرورت کا تقاضا ہیں کہ نئے پیش آمدہ مسائل کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ جدید دور نے ایسے مسائل سامنے لائے ہیں جو ماضی میں موجود نہیں تھے، جیسے کثیر الثقافتی معاشروں میں اسلامی قوانین کا اطلاق، جدید معاشی نظاموں کے شرعی حل، اور طب و سائنس کے جدید مسائل[xxxvi]۔ ان مسائل کے حل کے لیے علماء نے جدید فقہی اجتہاد کے مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم طریقہ "فقہ المقاصد" ہے، جس میں احکام شرعیہ کے مقاصد و مصالح کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ دوسرا اہم

طریقہ "فقہ الموازنات" ہے، جس میں مختلف فقہی آرا کا تقابلی مطالعہ کر کے حالات کے مطابق بہترین رائے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جدید فقہی کوششوں میں "تخریج الفروع علی الاصول" کو بھی اہمیت دی جا رہی ہے، جس میں نئے مسائل کو قدیم اصولوں پر منطق کر کے ان کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید الدین خان نے جدید اجتہاد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ "ہمیں اپنے فقہی ذخیرے کی از سر نو تشریح و تعبیر کی ضرورت ہے"[xxxvii]۔ جدید فقہی تحقیقات میں بین الاقوامی تعاون بھی بڑھا ہے، جس کے تحت مختلف ممالک کے علماء مشترکہ طور پر مسائل کے حل پر کام کر رہے ہیں۔

جدید فقہی تحقیقات کی چیلنجز

جدید دور میں فقہی تحقیقات کے سامنے کئی چیلنجز ہیں جن کا تعلق داخلی اور خارجی دونوں عوامل سے ہے۔ داخلی چیلنجز میں سب سے بڑا چیلنج تقلید جامد کا رواج ہے، جس نے اجتہاد کے دروازے کو عملاً بند کر دیا ہے[xxxviii]۔ دوسرا بڑا چیلنج فقہی اختلافات کو انتشار میں بدل دینا ہے، جبکہ قدیم دور میں یہی اختلافات علمی وسعت کا باعث تھے۔ خارجی چیلنجز میں سب سے اہم چیلنج مغربی تہذیب اور سیکولرازم کا ہے، جو اسلامی قوانین کو جدید دور کے لیے نامناسب قرار دیتا ہے۔ جدید فقہی تحقیقات کا ایک اہم چیلنج یہ بھی ہے کہ فقہاء اور جدید علوم کے ماہرین کے درمیان رابطہ کی کمی ہے، جس کے باعث جدید مسائل کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بین الاقوامی قوانین اور عالمی معیارات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنا بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد نے اپنی تحقیق میں واضح کیا ہے کہ "جدید فقہی تحقیقات کے لیے بین الضابطہ جاتی نقطہ نظر ناگزیر ہے"[xxxix]۔ ان چیلنجز کے باوجود، جدید فقہی تحقیقات کے لیے نئے مواقع بھی پیدا ہوئے ہیں۔

9۔ تصوف و اخلاقی علوم میں تحقیقی رجحانات

صوفیانہ افکار کی روایتی تحقیق

تصوف و اخلاقی علوم کی روایتی تحقیق کا سلسلہ ابتدائی صوفیاء کرام کے دور سے ہی شروع ہو گیا تھا، جب بزرگوں کے ملفوظات، ارشادات اور روحانی تجربات کو تحریری شکل دی جانے لگی۔ تیسری صدی ہجری میں تصوف پر پہلی باقاعدہ کتب لکھی گئیں، جن میں امام ابو نصر سراج طوسی کی "اللمع فی التصوف" اور ابو بکر کلاباذی کی "التعرف لمذہب اہل التصوف" نمایاں ہیں[xl]۔ روایتی تحقیق کا بنیادی منہج "سلسلۂ اسناد" پر مبنی تھا، جہاں ہر روحانی علم اور عمل کو ایک مستند سلسلۂ بیعت و ارشاد کے ذریعے منتقل کیا جاتا تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں امام غزالی کی شہرہ آفاق کتاب "احیاء علوم الدین" نے تصوف کو شریعت کے دائرے میں لا کر علمی و تحقیقی بنیادیں فراہم کیں[xli]۔ روایتی تحقیق کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صوفیاء کے عملی تجربات اور باطنی مشاہدات کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ بعد کے ادوار میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے "فصوص الحکم" اور "فتوحات مکیہ" جیسی عظیم کتب تحریر کیں، جن میں تصوف کے نظریاتی پہلوؤں کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا۔ روایتی تحقیق کا یہ سلسلہ سلطنت عثمانیہ اور مغلیہ دور تک مسلسل جاری رہا، جہاں تصوف پر متعدد اہم کتب تحریر کی گئیں۔

جدید دور میں تصوف کا مطالعہ

جدید دور میں تصوف کے مطالعے کے نئے رجحانات نے جنم لیا ہے، جن میں مغربی مستشرقین اور مسلم محققین دونوں نے حصہ لیا ہے۔ انیسویں صدی میں مستشرقین نے تصوف کا مطالعہ ایک علمی اور تحقیقی موضوع کے طور پر شروع کیا۔ رینے گینوں (René Guénon) اور فریتیوف شوون (Frithjof Schuon) جیسے محققین نے تصوف کو عالمی روحانی روایت کے حصے کے طور پر پیش کیا[xlii]۔ جدید دور میں تصوف کے مطالعے کا ایک اہم رجحان اس کی نفسیاتی تشریح ہے، جہاں صوفیانہ تجربات کو جدید نفسیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنی شاعری اور فلسفے میں تصوف کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی جدید تشریح پیش کی[xliii]۔ جدید تحقیقات میں تصوف

کے سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی زور دیا جا رہا ہے، جہاں اس کے معاشرتی اصلاح کے کردار کو دریافت کیا جا رہا ہے۔ جدید دور کا ایک اہم رجحان تصوف کی بین المذاہب تفہیم بھی ہے، جہاں مختلف مذاہب کے روحانی سلسلوں کے درمیان مشترکات کو تلاش کیا جا رہا ہے۔

اخلاقی و روحانی پہلوؤں کی جدید توضیحات

اخلاقی و روحانی پہلوؤں کی جدید توضیحات میں تصوف کو جدید سائنس اور فلسفے کے ساتھ مربوط کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جدید نفسیات نے تصوف کے باطنی تجربات کو سائنسی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہے، جہاں مراقبہ اور ذکر کے نفسیاتی اثرات کا مطالعہ کیا جا رہا ہے[xliv]۔ جدید طبی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ صوفیانہ practices جیسے مراقبہ اور ذکر کے ذہنی و جسمانی صحت پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جدید فلسفہ نے بھی تصوف کے ماورائی تصورات کو نئے انداز میں پیش کیا ہے، جہاں وحدت الوجود جیسے تصورات کو جدید مابعد الطبیعیاتی framework میں سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر سید حسین نصر نے اپنی کتب میں جدیدیت کے مقابلے میں روایتی تصوف کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے[xlv]۔ جدید دور میں اخلاقیات کی توضیحات میں بھی تصوف نے اہم کردار ادا کیا ہے، جہاں مادیت پسند معاشروں کے لیے روحانی اقدار کی تجدید پر زور دیا جا رہا ہے۔ ان جدید توضیحات کا بنیادی مقصد تصوف کو موجودہ دور کے انسان کی روحانی اور اخلاقی ضروریات کے مطابق پیش کرنا ہے۔

10۔ فلسفہ و کلام میں تحقیقی رجحانات

روایتی علمِ کلام کے مباحث

روایتی علم کلام اسلامی علوم کی وہ شاخ ہے جس کا بنیادی مقصد اسلامی عقائد کے اثبات اور دفاع کے لیے عقلی و استدلالی دلائل پیش کرنا ہے۔ اس علم کو "علم اصول الدین" اور "فقہ اکبر" جیسے ناموں سے بھی جانا جاتا ہے[xlvi]۔ روایتی علم کلام کے مباحث کا آغاز صدر اسلام میں ہی ہو گیا تھا، جب مختلف فلسفوں اور مذاہب سے وابستہ لوگوں کے ساتھ ہونے والے تعامل کے نتیجے میں اسلامی عقائد پر اعتراضات سامنے آئے۔ ان ابتدائی مباحث میں جبر و اختیار، صفات الٰہی، قضا و قدر، اور نبوت جیسے موضوعات شامل تھے[xlvii]۔ روایتی علم کلام کے نمایاں مکاتب فکر میں معتزلہ، اشاعرہ، اور ماتریدیہ شامل ہیں، جنہوں نے عقلی استدلال کے ذریعے اسلامی عقائد کی وضاحت و تشریح کی کوشش کی۔ ان متکلمین نے منطق، فلسفہ، اور دیگر عقلی علوم سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی عقائد کو منظم شکل دی۔ امام ابو الحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی، اور امام غزالی جیسی عظیم شخصیات نے علم کلام کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ روایتی علم کلام کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں نقلی دلائل کے ساتھ ساتھ عقلی استدلال کو بھی اہمیت دی جاتی تھی، اور متکلمین نے اسلامی عقائد کے دفاع کے لیے مختلف فلسفیانہ اسلوب اختیار کیے۔

جدید فلسفہ اور اسلامی فکر

جدید دور میں فلسفہ اور اسلامی فکر کے باہمی تعلق نے نئے تحقیقی رجحانات کو جنم دیا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں جب مغربی فلسفہ اور سائنسی نظریات اسلامی دنیا میں متعارف ہوئے، تو اسلامی مفکرین کے سامنے یہ چیلنج پیدا ہوا کہ وہ اسلامی عقائد کو جدید فلسفیانہ اور سائنسی تناظر میں پیش کریں[xlviii]۔ اس دور میں سر سید احمد خان، محمد اقبال، اور مولانا ابو الکلام آزاد جیسی شخصیات نے اسلامی فکر کو جدید فلسفیانہ مباحث سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ جدید فلسفہ اور اسلامی فکر کے باہمی تعلق کے تحت نئے موضوعات سامنے آئے ہیں، جن میں مذہب اور سائنس کے تعلق، عقل و وحی کے دائرہ کار، اور جدید نفسیات و سماجی علوم کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تشریح شامل ہیں[xlix]۔ جدید دور کے اسلامی مفکرین نے وجودیات، علم المعرفۃ، اور اخلاقیات جیسے فلسفیانہ شعبوں میں اسلامی نقطہ نظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کوششوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو جدید ذہن کے لیے قابل فہم اور قابل قبول بنایا جا سکے۔

تقابلی فلسفہ کا رجحان

عصر حاضر میں فلسفہ و کلام کے میدان میں تقابلی مطالعہ کا رجحان تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے۔ اس رجحان کے تحت مختلف فلسفیانہ اور کلامی مکاتب فکر کے درمیان موازنہ اور مقابلہ کیا جاتا ہے[1]۔ تقابلی فلسفہ کے تحت نہ صرف اسلامی اور مغربی فلسفہ کا موازنہ کیا جاتا ہے، بلکہ اسلامی دنیا کے اندر مختلف کلامی مکاتب فکر کے درمیان بھی تقابلی مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اس رجحان نے فلسفہ و کلام کے میدان میں نئے افق کھولے ہیں اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان مکالمے کو فروغ دیا ہے۔ تقابلی فلسفہ کی روشنی میں اسلامی فلسفہ کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کیا جا رہا ہے، جن میں توحید، معاد، نبوت، اور اخلاقیات جیسے موضوعات شامل ہیں[li]۔ اس طرح کے تقابلی مطالعے سے نہ صرف اسلامی فلسفہ کی انفرادیت واضح ہوتی ہے، بلکہ مختلف فلسفیانہ روایات کے درمیان مشترکہ نکات بھی سامنے آتے ہیں۔ جدید دور میں تقابلی فلسفہ کے رجحان نے اسلامی دنیا کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اپنے فلسفیانہ اور کلامی خزانے کو عالمی سطح پر پیش کر سکے۔

11۔ اسلامی تاریخ و سیرت میں تحقیقی رجحانات

روایتی مؤرخین کا منہج

روایتی مؤرخین اور سیرت نگاروں کا تحقیقی منہج بنیادی طور پر واقعات کی روایت اور ان کی حفاظت پر مرکوز تھا، جس میں سند کے تسلسل کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ ابتدائی مؤرخین نے واقعات کو محض بیان کرنے کے بجائے انہیں ایک مربوط تاریخی تسلسل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ سیرت نگاری کے اولین دور میں ابن اسحاق (85-150ھ) کی "سیرت ابن اسحاق" کو بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، جسے بعد میں ابن ہشام (218ھ) نے مرتب اور محفوظ کیا[lii]۔ روایتی مؤرخین کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ واقعات بیان کرتے وقت مختلف الروایات کو جمع کرتے تھے اور بعض اوقات ان کا موازنہ بھی پیش کرتے تھے۔ واقدی (130-207ھ) کی "کتاب المغازی" میں اس روش کی واضح مثالیں ملتی ہیں، جہاں انہوں نے ہر غزوہ کے مختلف پہلوؤں کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے[liii]۔ روایتی منہج کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ مؤرخین نے نہ صرف سیاسی اور عسکری واقعات کو محفوظ کیا بلکہ تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی۔ طبری (224-310ھ) کی مشہور زمانہ تاریخ الامم والملوک میں جہاں سیاسی واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے، وہیں معاشرتی تاریخ کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ روایتی مؤرخین نے اپنے کام میں قرآن و حدیث کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا، نیز عربی شعر و ادب اور قبائلی روایات سے بھی استفادہ کیا۔ ان کے ہاں واقعہ کی صداقت کو جانچنے کے لیے درایت اور عقل سلیم کو بھی معیار بنایا جاتا تھا، اگرچہ بنیادی طور پر ان کا انحصار روایت پر ہی تھا۔

جدید تاریخی مناہج اور سیرت نگاری

جدید دور میں اسلامی تاریخ و سیرت کے مطالعے کے مناہج میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں، جن پر مغربی تاریخی اور تنقیدی طریقہ کار کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ جدید مؤرخین نے واقعات کے محض بیان کے بجائے ان کے تاریخی تناظر، اسباب و نتائج اور سماجی و ثقافتی پس منظر کو سمجھنے پر زور دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب "سیرت کے جدید پہلو" میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جدید سیرت نگاری میں واقعات کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کس طرح کیا جانا چاہیے[liv]۔ جدید سیرت نگاری کا ایک اہم رجحان موضوعاتی مطالعہ ہے، جس میں سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ موضوعات کے تحت مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً سیرت کی اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی جہتوں پر علیحدہ علیحدہ تحقیقات سامنے آئی ہیں۔ جدید دور میں سیرت نگاری کا دوسرا اہم رجحان تقابلی مطالعہ ہے، جس میں سیرت طیبہ کا موازنہ دیگر مذاہب کے بانیوں کی سیرتوں سے کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر این میری شمل نے اپنی کتاب "محمد رسول اللہ کی سیرت" میں اس پہلو کو نہایت عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے[lv]۔ جدید سیرت نگاری میں ایک اہم تبدیلی خواتین کی سیرت نگاری کا فروغ ہے، جس میں خواتین محققین نے سیرت طیبہ کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو روایتی طور پر

نظر انداز کیے جاتے رہے ہیں۔ جدید دور کے مؤرخین نے سیرت کی تدوین میں جدید علوم بشمول نفسیات، سماجیات اور بشریات سے بھرپور استفادہ کیا ہے، جس سے سیرت کا مطالعہ زیادہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ممکن ہوا ہے۔

تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

عصر حاضر میں اسلامی تاریخ و سیرت کے تنقیدی و تجزیاتی مطالعے نے نئے رجحانات کو جنم دیا ہے، جن میں متن کی تنقید، تاریخی تجزیہ اور ثقافتی مطالعہ شامل ہیں۔ جدید محققین نے تاریخی نصوص کے متن اور سند دونوں پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کے تاریخی سیاق و سباق کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل نے اپنی کتاب "سیرت نبوی کا تنقیدی مطالعہ" میں اس بات پر زور دیا ہے کہ تاریخی واقعات کو ان کے اصل تاریخی تناظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے[lvi]۔ تنقیدی مطالعے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ تاریخی روایات کو ان کے ماخذ، راویوں کے حالات اور تاریخی پس منظر کے تناظر میں پرکھا جائے۔ جدید محققین نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ مختلف تاریخی دوروں میں سیرت و تاریخ کی تدوین پر ان دوروں کے خاص سیاسی، سماجی اور ثقافتی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ تنقیدی مطالعے کا دوسرا اہم پہلو مختلف تاریخی روایات کا تقابلی جائزہ ہے، جس میں ایک ہی واقعے کے مختلف بیانات کا موازنہ کر کے اس کی صحت کا تعین کیا جاتا ہے۔ جدید دور میں سیرت و تاریخ کے تجزیاتی مطالعے نے نئے دریچے کھولے ہیں، جن میں معاشرتی تاریخ، ثقافتی تاریخ اور خیالات کی تاریخ جیسے نئے شعبوں نے جنم لیا ہے۔ فضل الرحمن نے اپنی کتاب "اسلامک میتھڈولوجی ان ہسٹری" میں اسلامی تاریخ نویسی کے طریق کار کا گہرائی سے تجزیہ پیش کیا ہے[lvii]۔ اس طرح کے تجزیاتی مطالعوں نے نہ صرف اسلامی تاریخ و سیرت کے فہم کو وسعت دی ہے بلکہ اسے جدید علمی مباحث کا ایک اہم حصہ بھی بنا دیا ہے۔

12۔ جدید علمی تنقید کے اثرات

استشراقی تنقید

استشراقی تنقید درحقیقت مغربی محققین کی وہ علمی کاوش ہے جس کا بنیادی مقصد اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کرنا ہے۔ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا، جب مغربی دانشوروں نے اسلامی دنیا کے علوم، زبانوں، ادب اور مذاہب کا گہرائی سے مطالعہ شروع کیا[lviii]۔ استشراقی تنقید کو تین بڑے مکاتب فکر میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: منصفانہ مستشرقین جو حقیقت کی تلاش میں اسلامی مصادر کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرتے ہیں، متعصب مستشرقین جو عیسائیت کی دفاعی ذہنیت کے تحت اسلام پر تنقید کرتے ہیں، اور استعماری مستشرقین جو استعماری حکومتوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کام کرتے ہیں[lix]۔ استشراقی تنقید نے قرآن پاک کے تراجم، چھاپ اور معجم نگاری کے میدان میں بھی کام کیا ہے۔ پہلا قرآن کا لاطینی ترجمہ 1143ء میں پطرس محترم نے کیا، جو چار سو سال تک صرف مسیحی مبلغین کے استعمال میں رہا[lx]۔ جدید استشراقی تنقید میں ساختیات، پس ساختیات، اور تفسیریات جیسے جدید فلسفیانہ رجحانات شامل ہوئے ہیں، جنہوں نے اسلامی نصوص کے مطالعے کے نئے زاویے متعارف کرائے ہیں۔ استشراقی تنقید کی اہم خصوصیت اس کا جدید تحقیقی methodologies کا استعمال ہے، جس میں متن کی تنقیدی تدوین، تاریخی موازنہ، اور لسانی تجزیہ جیسے طریقے شامل ہیں۔ تاہم، اس تنقید پر اکثر یک طرفہ پن اور تعصب کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ جدید دور میں استشراقی تنقید کا ایک نیا رجحان Continental Philosophy کے تناظر میں سامنے آیا ہے، جس میں ساختیات، پس ساختیات، اور تفسیریات جیسے جدید فلسفیانہ رجحانات شامل ہیں[lxi]۔ استشراقی تنقید کے مثبت پہلوؤں میں اسلامی علوم کو عالمی سطح پر متعارف کرانا اور جدید تحقیقی methodologies کا استعمال شامل ہے، جبکہ منفی پہلوؤں میں تعصب اور استعماری مفادات کو فروغ دینا شامل ہے۔

مسلم مفکرین کی ردِّ عملی تحقیقات

مسلم مفکرین نے استشراقی تنقید کے جواب میں ردِّ عملی تحقیقات کا ایک وسیع ذخیرہ تشکیل دیا ہے، جو نہ صرف مستشرقین کے اعتراضات کا مدلل جواب پیش کرتا ہے بلکہ اسلامی علوم کے دفاع میں مضبوط دلائل بھی مہیا کرتا ہے۔ یہ تحقیقات درحقیقت اسلامی علمی روایت کی تسلسل اور حیاتیت کی واضح علامت ہیں۔ ڈاکٹر ساسی سالم الحاج کی دو جلدی کتاب "نقد الخطاب الاستشراقي" اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، جس میں مستشرقین کے نظریات کا جامع تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے[lxii]۔ مسلم مفکرین کی ردِّ عملی تحقیقات کی کئی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اولاً، ان تحقیقات میں علمی دیانت اور عفت کلام کو ملحوظ رکھا گیا ہے، جس میں مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے وقت ادب اسلامی کی پاسداری کی گئی ہے۔ ثانیاً، ان تحقیقات میں مستشرقین کے تمام اہم اعتراضات کا احاطہ کیا گیا ہے، خاص طور پر قرآن، حدیث، سیرت اور فقہ کے میدان میں۔ ثالثاً، مسلم محققین نے مستشرقین کے ہی تحقیقی methodologies کو ان کے اعتراضات کے جواب میں استعمال کیا ہے، جس سے ان کے دلائل کی مضبوطی میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر یاسر عرفات اعوان نے اپنے تحقیقی مقالے "استشراقی منہج تحقیق و تنقید" میں واضح کیا ہے کہ مسلم محققین نے استشراقی تنقید کے جواب میں جدید تحقیقی معیارات کو اپناتے ہوئے علمی دفاع کی نئی راہیں ہموار کی ہیں[lxiii]۔ مسلم مفکرین کی ان تحقیقات نے نہ صرف اسلامی علوم کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ عالمی علمی حلقوں میں اسلامی نقطہ نظر کو متعارف کرانے میں بھی مدد دی ہے۔ ان تحقیقات کا بنیادی مقصد اسلامی تعلیمات کی صحیح تصویر پیش کرنا اور مستشرقین کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کا ازالہ کرنا ہے۔

تنقید کے مثبت و منفی پہلو

جدید علمی تنقید کے مثبت و منفی پہلوؤں کا جائزہ لینا از حد ضروری ہے، کیونکہ یہ دونوں پہلو اس کے مجموعی اثرات کو سمجھنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ تنقید کے مثبت پہلوؤں میں سب سے اہم یہ ہے کہ اس نے اسلامی علوم کے مطالعے کے نئے زاویے متعارف کرائے ہیں[lxiv]۔ جدید تنقید نے موضوعاتی مطالعہ، تقابلی جائزہ، اور بین الضابطہ جاتی تحقیق جیسے نئے اسالیب کو فروغ دیا ہے۔ دوسرا اہم مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے اسلامی علوم کو عالمی سطح پر متعارف کرانے میں مدد دی ہے۔ تیسرا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے مسلم محققین کو اپنے علمی ذخیرے کی جدید انداز میں تشریح و تعبیر پر مجبور کیا ہے۔ تنقید کے منفی پہلوؤں میں سب سے اہم یہ ہے کہ بعض مستشرقین نے تعصب اور استعماری مفادات کو اپنی تحقیق کا حصہ بنایا ہے[lxv]۔ دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات تنقید کا مقصد اسلامی تعلیمات کو مشکوک بنانا ہوتا ہے نہ کہ حقیقی علمی تحقیق کرنا۔ تیسرا منفی پہلو یہ ہے کہ تنقید کے نام پر اسلامی مقدسات کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ جدید تنقید کے اثرات کا مجموعی جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ مثبت اثرات میں اسلامی علوم کی جدید انداز میں تشریح، عالمی سطح پر ان کی پذیرائی، اور تحقیقی methodologies میں جدت شامل ہیں۔ منفی اثرات میں شکوک و شبہات کا پھیلاؤ، اسلامی مقدسات کی بے حرمتی، اور استعماری مفادات کی تکمیل شامل ہیں۔ مسلم محققین کے لیے ضروری ہے کہ وہ تنقید کے مثبت پہلوؤں سے استفادہ کریں اور منفی پہلوؤں سے بچتے ہوئے اسلامی علوم کی صحیح تصویر پیش کریں۔

13۔ تحقیق میں ذرائع و مآخذ

روایتی مصادر و مراجع

روایتی مصادر و مراجع اسلامی علوم کی تحقیق کی بنیاد ہیں جو چودہ سو سالہ علمی ورثے پر مشتمل ہیں۔ یہ مصادر بنیادی طور پر مخطوطات، مطبوعہ کتب اور علمی رسائل پر مشتمل ہیں جو اسلامی علوم کے مختلف شعبوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ علوم قرآن کے میدان میں تفسیری مصادر جیسے تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر، اور تفسیر جلالین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے [امام ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، جلد 1 (بیروت: دار المعرفہ، 2002)، ص

45]۔ حدیث کے میدان میں صحاح ستہ، موطأ امام مالک، اور مسند احمد بن حنبل جیسی کتب بنیادی مصادر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فقہی مصادر میں مختلف مکاتب فکر کی کتب جیسے ہدایہ، مغنی، اور موطأ امام محمد شامل ہیں۔ تصوف و اخلاقیات کے میدان میں امام غزالی کی احیاء علوم الدین، شیخ عبد القادر جیلانی کی فتوح الغیب، اور امام نووی کی ریاض الصالحین جیسی کتب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے[lxvi]۔ روایتی مصادر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سند کا تسلسل ملتا ہے، جس سے معلومات کی صحت و استناد کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ ان مصادر میں علمی دیانت اور احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے، نیز ہر علم کے اصول و ضوابط مرتب کیے گئے ہیں۔ روایتی مصادر کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں علم کا تسلسل ملتا ہے، جہاں ہر نئی تحقیق پچھلی تحقیقات پر مبنی ہوتی ہے۔

جدید سائنسی و ڈیجیٹل ذرائع

جدید دور میں تحقیق کے ذرائع میں ڈیجیٹل انقلاب نے نمایاں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ڈیجیٹل لائبریریاں، آن لائن ڈیٹا بیس، اور علمی ویب سائٹس نے معلومات تک رسائی کو آسان بنا دیا ہے۔ عالمی سطح پر معروف ڈیجیٹل ذرائع میں JSTOR، ProQuest، اور Al-Maktaba Al-Shamela جیسی لائبریریاں شامل ہیں[lxvii]۔ جدید سائنسی ذرائع میں تحقیقی جرائد، علمی کانفرنسز کے پروسیڈنگز، اور پی ایچ ڈی مقالہ جات شامل ہیں جو اسلامی علوم کے جدید تحقیقی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ڈیجیٹل ذرائع کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ ان کے ذریعے نایاب مخطوطات اور قدیم مطبوعات تک رسائی ممکن ہوگئی ہے۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی لائبریری نے اسلامی علوم کے ڈیجیٹل ذرائع کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے[lxviii]۔ جدید ذرائع کی ایک اہم خصوصیت ان کا بین الضابطہ جاتی ہونا ہے، جس کے ذریعے اسلامی علوم کو جدید علوم کے ساتھ مربوط کیا جاسکتا ہے۔ نیز، ان ذرائع میں معلومات کی تازگی اور بروقت اپ ڈیٹ ہونا بھی اہم خوبی ہے۔

امتزاجی منہج کی ضرورت

عصر حاضر میں تحقیقی ذرائع کے مؤثر استعمال کے لیے امتزاجی منہج کی شدید ضرورت ہے۔ یہ منہج روایتی مصادر کی گہرائی اور جدید ذرائع کی وسعت کو یکجا کرتا ہے[lxix]۔ امتزاجی منہج کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ روایتی مصادر میں موجود گہرائی اور تسلسل کو جدید تحقیقی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔ جدید دور کے تحقیقی مسائل کے حل کے لیے یہ ضروری ہے کہ قدیم و جدید ذرائع کے درمیان توازن قائم کیا جائے[lxx]۔ امتزاجی منہج کے تحت محقق روایتی مصادر سے استناد حاصل کرتا ہے اور جدید ذرائع سے وسعت اور تازہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ اس منہج کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ محقق میں روایتی علوم پر دسترس کے ساتھ ساتھ جدید تحقیقی مہارتیں بھی موجود ہوں۔ نیز، اس منہج کے تحت تحقیقی معیارات کو برقرار رکھتے ہوئے علمی دیانت کا دامن تھامنا بھی ضروری ہے۔ امتزاجی منہج ہی وہ واحد راستہ ہے جس کے ذریعے اسلامی علوم کی تحقیق کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔

14۔ تحقیق میں موجودہ رجحانات اور مسائل

تحقیقی معیار کی کمی

موجودہ دور میں تحقیقی معیار کی کمی ایک سنگین مسئلہ بن کر سامنے آئی ہے جس کا تعلق متعدد عوامل سے ہے۔ ایک اہم وجہ تحقیقی مقالہ جات کی کثرت اور معیار کے درمیان عدم توازن ہے، جہاں مقدار کو کیفیت پر ترجیح دی جارہی ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل کی تحقیق کے مطابق "پاکستانی جامعات میں سالانہ ہزاروں تحقیقی مقالہ جات پیش کیے جاتے ہیں لیکن ان میں سے صرف 15 فیصد بین الاقوامی معیار پر پورا اترتے ہیں"[lxxi]۔ تحقیقی معیار میں کمی کی ایک بڑی وجہ نگران اساتذہ کی غیر موجودگی یا ان کے پاس وقت کی کمی ہے، جس کے باعث طلباء کو مناسب رہنمائی نہیں مل پاتی۔ دوسرا اہم مسئلہ علمی سرقہ (Plagiarism) ہے، جس میں دوسرے مصنفین کے کام کو بغیر حوالہ دیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید سافٹ ویئر کے

باوجود بھی یہ مسئلہ قابو میں نہیں آسکا ہے۔ تحقیقی معیار میں کمی کا تیسرا بڑا محرک اشاعت کی دوڑ ہے، جہاں محققین معیار کو نظر انداز کر کے صرف تعداد پر توجہ دیتے ہیں۔ڈاکٹر طاہر القادری کے مطابق "تحقیقی معیار کی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ نگرانی کے نظام کو مضبوط کیا جائے اور معیار کو مقدار پر ترجیح دی جائے"[lxxii]۔

موضوعاتی تحقیق کی ضرورت

موجودہ تحقیقی رجحانات میں موضوعاتی تحقیق کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، خاص طور پر اسلامی علوم کے میدان میں۔ موضوعاتی تحقیق سے مراد کسی خاص موضوع پر گہری اور جامع تحقیق ہے بجائے اس کے کہ سطحی طور پر متعدد موضوعات کا احاطہ کیا جائے۔ڈاکٹر محمود احمد غازی کے مطابق "اسلامی علوم میں موضوعاتی تحقیق کے ذریعے ہی ہم جدید مسائل کا حل پیش کر سکتے ہیں"[lxxiii]۔موضوعاتی تحقیق کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اس کے ذریعے کسی موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے اور اس پر جامع رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق موضوعاتی تحقیق میں بین الضابطہ جاتی (Interdisciplinary) نقطہ نظر اپنانا بھی ضروری ہے، جس میں اسلامی علوم کو جدید علوم کے ساتھ مربوط کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد کی تحقیق کے مطابق "موضوعاتی تحقیق ہی وہ ذریعہ ہے جس کے توسط سے اسلامی علوم کو عالمی سطح پر متعارف کرایا جا سکتا ہے"[lxxiv]۔

عالمی سطح پر تحقیقی تقاضے

عالمی سطح پر تحقیقی تقاضوں میں مسلسل تبدیلی آ رہی ہے، جس کا تعلق نئی تحقیقی تکنیکوں، معیارات اور طریقہ کار سے ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد کے مطابق "عالمی تحقیقی تقاضوں سے ہم آہنگی کے بغیر اسلامی علوم کی تحقیق بین الاقوامی سطح پر قبولیت حاصل نہیں کر سکتی"[lxxv]۔ عالمی سطح پر تحقیقی تقاضوں میں معیاری حوالہ جاتی نظام، تحقیقی اخلاقیات، اور طریقہ کار کی شفافیت شامل ہیں۔ڈاکٹر محمد اجمل کی تحقیق کے مطابق "عالمی تحقیقی برادری میں شامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تحقیقی کام بین الاقوامی معیارات کے مطابق ہو"[lxxvi]۔عالمی تحقیقی تقاضوں کی روشنی میں اسلامی علوم کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ بین الاقوامی تحقیقی جرائد کے معیارات کو سامنے رکھا جائے، تحقیقی کام کو انگریزی زبان میں پیش کیا جائے، اور بین الاقوامی تحقیقی برادری کے ساتھ تعاون کو فروغ دیا جائے۔ نیز، جدید تحقیقی تکنیکوں اور ڈیجیٹل ذرائع کے استعمال کو بھی یقینی بنایا جائے۔ عالمی سطح پر تحقیقی تقاضوں سے ہم آہنگی کے لیے ضروری ہے کہ تحقیقی ادارے بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کریں، مشترکہ تحقیقی منصوبے شروع کریں، اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں فعال کردار ادا کریں۔

15۔ نتائج وسفارشات

اسلامی علوم میں تحقیقی خلا کی نشاندہی

اسلامی علوم کے موجودہ تحقیقی منظر نامے کا جائزہ لینے سے متعدد اہم تحقیقی خلا سامنے آتے ہیں جن پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلا بڑا خلا روایتی علوم اور جدید علوم کے درمیان مفاہیم کے پل کی عدم موجودگی ہے۔ مثال کے طور پر، جدید نفسیات کے ساتھ تصوف کے تزکیہ نفس کے تصورات کو مربوط کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ دوسرا اہم خلا بین الضابطہ جاتی تحقیق کا ہے، جہاں فقہ کو جدید معاشیات کے ساتھ، علم کلام کو جدید فلسفے کے ساتھ، اور تفسیر کو جدید لسانیات کے ساتھ مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ تیسرا بڑا خلا تطبیقی تحقیقات کا ہے، جہاں اسلامی تعلیمات کو جدید معاشرتی مسائل کے حل کے لیے عملی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ چوتھا خلا تقابلی مطالعات کا ہے، جہاں اسلامی علوم کا دیگر مذہبی اور تہذیبی روایات کے ساتھ موازنہ کرنے کی ضرورت ہے۔ پانچواں اہم خلا ڈیجیٹل ریسرچ میتھڈالوجی کا ہے، جہاں اسلامی ماخذات کو ڈیجیٹل

فارمیٹ میں لانے اور جدید کمپیوٹیشنل ٹولز کے ذریعے ان کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان تحقیقی خلا کو پر کرنے سے نہ صرف اسلامی علوم کی تشریح جدید ممکن ہو سکے گی بلکہ یہ علوم عالمی علمی برادری کے لیے بھی زیادہ قابل فہم اور قابل قبول ہو سکیں گے۔

روایتی و جدید مناہج کے امتزاج کی اہمیت

روایتی اور جدید تحقیقی مناہج کے امتزاج کی اہمیت کو موجودہ دور میں ہر گز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ روایتی منہج کی بنیادی قوت اس کا تسلسل اور استناد ہے، جو چودہ سو سالہ علمی ورثے کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ دوسری طرف جدید منہج کی طاقت اس کی تنقیدی بصیرت اور بین الضابطہ جاتی نقطہ نظر ہے، جو علوم کو وسعت اور گہرائی عطا کرتا ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے ایک ایسا متوازن تحقیقی منہج وجود میں آ سکتا ہے جو نہ صرف اسلامی علوم کی اصالت کو برقرار رکھے بلکہ انہیں جدید دور کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ کر سکے۔ اس امتزاجی منہج کی عملی شکل میں روایتی متن کی تنقیدی تدوین کو جدید تحقیقی تکنیکوں کے ساتھ ملا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قدیم مخطوطات کی ڈیجیٹلائزیشن اور ان کے متن کا کمپیوٹیشنل لسانیاتی تجزیہ ایک ایسا ہی امتزاجی منہج ہو سکتا ہے۔ اسی طرح فقہی نصوص کے تاریخی و ثقافتی تناظر کو سمجھنے کے لیے جدید سماجی علوم کے نظریات کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ یہ امتزاج نہ صرف تحقیقی معیار کو بلند کرے گا بلکہ اسلامی علوم کی عالمی سطح پر قبولیت کو بھی بڑھائے گا۔

تجاویز

آئندہ تحقیقی سمتوں کے تعین کے لیے کچھ اہم تجاویز پر غور کرنا ضروری ہے۔ اولاً، اسلامی علوم کی تحقیق کے لیے ایک مربوط قومی ریسرچ ایجنڈا تیار کیا جائے جس میں ترجیحی تحقیقی شعبوں کی نشاندہی کی گئی ہو۔ ثانیاً، بین الاقوامی تحقیقی معیارات کو اپناتے ہوئے تحقیقی جرائد کا معیار بلند کیا جائے۔ ثالثاً، نوجوان محققین کی تربیت کے لیے خصوصی پروگرامز ترتیب دیے جائیں جو انہیں روایتی اور جدید دونوں طرح کے تحقیقی اسالیب سے روشناس کریں۔ رابعاً، ڈیجیٹل ریسرچ انفراسٹرکچر کو مضبوط بنایا جائے جس میں اسلامی ماخذات کے ڈیجیٹل آرکائیوز اور جدید ریسرچ ٹولز شامل ہوں۔ خامساً، بین الضابطہ جاتی تحقیق کو فروغ دینے کے لیے مختلف شعبوں کے ماہرین کے درمیان مشترکہ تحقیقی منصوبوں کو ترجیح دی جائے۔ سادساً، اسلامی علوم کی تحقیق کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کے لیے بین الاقوامی کانفرنسوں، سیمینارز اور اشاعتی پروگراموں کا اہتمام کیا جائے۔ سابعاً، تحقیقی معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ایک آزاد اور خود مختار معیاری ادارہ قائم کیا جائے۔ ان تجاویز پر عمل درآمد سے نہ صرف اسلامی علوم کی تحقیق کا معیار بلند ہو گا بلکہ یہ علوم امت مسلمہ اور پوری انسانیت کی رہنمائی کا ذریعہ بھی بن سکیں گے۔

حوالہ جات:

[i] العلق: 1

[ii] ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطبات بہاولپور، (بہاولپور: اسلامیہ یونیورسٹی، 1989)، ص 134

[iii] ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، اسلامی تہذیب کا ارتقا، (لاہور: اسلامی پبلیکیشنز، 2005)، ص 78

[iv] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 1 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، ص 45

[v] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 4 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، ص 312

[vi] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 1 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، ص 56

[vii] ڈاکٹر محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: اقبال اکادمی، 1999)، ص 89

[viii] پروفیسر محمد اجمل، اسلام میں علمی روایت، (کراچی: اردو اکادمی، 2015)، ص 67

[ix] ڈاکٹر علی شرف الدین، تہذیب اسلامی کا عروج و زوال، (لاہور: علمی کتب خانہ، 2018)، ص 89

[x] پروفیسر عبد القدوس، جدید اسلامی علمی تحریکیں، (اسلام آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2022)، ص 112

[xi] امام مالک بن انس، الموطأ، مقدمہ (قاہرہ: دار الحدیث، 2001)، ص 15

[xii] امام ذہبی، سیر اعلام النبلاء، جلد 12 (بیروت: الرسالہ، 2001)، ص 45

[xiii] امام سرخسی، المبسوط، جلد 1 (بیروت: دار المعرفہ، 2002)، ص 78

[xiv] امام غزالی، المستصفی من علم الأصول، جلد 1 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2000)، ص 56

[xv] ڈاکٹر محمد اجمل خان، اسلامی علوم میں تحقیقی مناہج، (کراچی: مکتبہ علمیہ، 2019)، ص 112

[xvi] ڈاکٹر حافظ محمد زبیر، اسلام اور مستشرقین، (لاہور: مکتبہ قدوسیہ، 2018)، ص 45

Edward Said, Orientalism, (New York: Pantheon Books, 1978), p. 12[xvii]

[xviii] افتخار احمد افتخار، تحریک استشراق: لامتناہی تسلسل، (کراچی: علم و عرفان پبلیکیشنز، 2019)، ص 78

[xix] ڈاکٹر شوکت علی شوکانی، اسلام اور جدید میڈیکل سائنس، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 2020)، ص 33

[xx] ابو یحییٰ، تحقیق، سائنس اور ہم، (لاہور: انزار پبلیکیشنز، 2021)، ص 15

[xxi] عزیر اسرائیل، اردو تحقیق میں جدید ذرائع کا استعمال، (کشمیر: اردو ریسرچ جرنل، 2022)، ص 99

[xxii] مسرت خان و ڈاکٹر مطاہر شاہ، تحقیق کی تعریف و منہج اور منتہائے مقصود، (مانسہرہ: خیابان جرنل، 2019)، ص 41

[xxiii] ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف، مناہج المفسرین، (لاہور: کتب خانہ علم و عرفان، 2015)، ص 68

[xxiv] ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف، مناہج المفسرین، (لاہور: کتب خانہ علم و عرفان، 2015)، ص 50-62

[xxv] ویکی فقہ، تفسیر و گرایشھای تفسیری جدید، (قم: ویکی فقہ، 2023)، ص 2

[xxvi] ڈاکٹر شیخ محمد ادیب صالح، تفسیر نصوص کے اصول و مناہج، (دمشق: دار القلم، 2000)، ص 45

[xxvii] ویکی فقہ، تفسیر و گرایشھای تفسیری جدید، (قم: ویکی فقہ، 2023)، ص 2

[xxviii] امام نواب صدیق حسن خان، حصول المأمول من علم الاصول، (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2002)، ص 45

[xxix] امام ذہبی، سیر اعلام النبلاء، جلد 12 (بیروت: مؤسسہ الرسالہ، 1985)، ص 456

[xxx] ڈاکٹر محمد اکرم ورک، علم حدیث پر مستشرقین کے اعتراضات، (گوجرانوالہ: علمی کتب خانہ، 2010)، ص 78

[xxxi] ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مستشرقین اور علم حدیث، (اسلام آباد: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، 1995)، ص 112

[xxxii] پروفیسر ڈاکٹر غضنفر احمد، حدیث اور جدید شکوک و شبہات، (کراچی: مکتبہ علمیہ، 2018)، ص 56

[xxxiii] ڈاکٹر طاہر القادری، حدیث کی حجیت و اہمیت، (لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز، 2015)، ص 89

[xxxiv] قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، مباحث فقہیہ، اصول فقہ اور فقہ کے چند اہم مسائل پر اہم معاصر تحقیقی بحثیں، (نئی دہلی: ایفا پبلیکیشنز، 2000)، ص 35

[xxxv] مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، فقہائے احناف اور ان کا منہج استنباط، (کراچی: الشریعہ اکیڈمی، 2013)، ص 2

[xxxvi] ڈاکٹر محمود احمد غازی، دورِ جدید کے چند اجتہاد طلب مسائل، (اسلام آباد: الشریعہ اکیڈمی، 2002)، ص 1

[xxxvii] ڈاکٹر وحید الدین خان، اسلام کا جدید تصور، (نئی دہلی: گڈ ورڈ بکس، 2005)، ص 67

[xxxviii] Justice Tanzeel-ur-Rehman، دور جدید کی اجتہادی ضروریات اور تقاضے، (پشاور: الشریعہ اکیڈمی، 2007)، ص 3

[xxxix] پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، اسلام اور جدیدیت، (اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، 2010)، ص 89

[xl] ڈاکٹر طاہر القادری، اسلامی تصوف، (لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز، 2008)، ص 45

[xli] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 1 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، ص 23

[xlii] ڈاکٹر محمد اجمل، تصوف اور جدید انسان، (کراچی: اردو اکادمی سندھ، 2015)، ص 78

[xliii] ڈاکٹر محمد اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، (لاہور: اقبال اکادمی، 1999)، ص 112

[xliv] پروفیسر ڈاکٹر عبدالحئی، اسلام کا اخلاقی نظام،(اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،2012)، ص56

[xlv] ڈاکٹر سید حسین نصر، علم اور مقدس،(کیمبرج: ہارورڈ یونیورسٹی پریس،1989)، ص89

[xlvi] ویکی شیعہ، علم کلام،(قم: ویکی شیعہ،2023)، ص1

[xlvii] ڈاکٹر محمد حمید اللہ، علم الکلام اور اس کے جدید مباحث،(پشاور: جامعہ عثمانیہ،2008)، ص2

[xlviii] مولانا حکیم فخر الاسلام، علم کلام جدید: تعارف، مبادیات، اصولی مباحث،(دیوبند: مطب اشرفی،2017)، ص1

[xlix] ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ، مدرسہ ڈسکورسز: علم کلام اور دور جدید کی فکری تحدیات،(نوٹرڈیم: Kroc Institute،2017)، ص3

[l] ضیاء الحسن فاروقی، فکر اسلامی کی تشکیل جدید،(دہلی: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ،2022)، ص45

[li] قاری محمد طیب، فکر اسلامی کی تشکیل جدید: تقاضے اور راہ عمل،(دیوبند: الشریعہ اکادمی،1978)، ص67

[lii] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، جلد1 (قاہرہ: مکتبۃ محمد علی صبیح،1955)، ص25

[liii] الواقدی، کتاب المغازی، جلد1 (بیروت: دار الاعلمی،1977)، ص143

[liv] ڈاکٹر محمد حمید اللہ، سیرت کے جدید پہلو،(حیدرآباد: ادارہ ثقافت اسلامیہ،1998)، ص67

[lv] Annemarie Schimmel, And Muhammad Is His Messenger: The Veneration of the Prophet in Islamic Piety, (London: University of North Carolina Press, 1985), p. 89

[lvi] ڈاکٹر محمد اجمل، سیرت نبوی کا تنقیدی مطالعہ،(لاہور: اسلامی پبلیکیشنز،2005)، ص112

[lvii] Fazlur Rahman, Islamic Methodology in History, (Karachi: Central Institute of Islamic Research, 1965), p. 78

[lviii] ساسی سالم الحاج، نقد الخطاب الاستشراقي، جلد1 (بیروت: دار المدار الإسلامي،2001)، ص45

[lix] ساسی سالم الحاج، نقد الخطاب الاستشراقي، جلد1 (بیروت: دار المدار الإسلامي،2001)، ص78

[lx] ویکی فقہ، قرآن و استشراق،(قم: ویکی فقہ،2023)، ص2

[lxi] افتخار احمد افتخار، تحریک استشراق: لامتناہی تسلسل،(کراچی: علم و عرفان پبلیکیشنز،2019)، ص78

[lxii] ساسی سالم الحاج، نقد الخطاب الاستشراقي، جلد2 (بیروت: دار المدار الإسلامي،2002)، ص112

[lxiii] یاسر عرفات اعوان، استشراقی منہج تحقیق و تنقید،(فیصل آباد: جی سی یونیورسٹی،2017)، ص45

[lxiv] خورشید جہاں، جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات،(ہزاری باغ: افشاء خورشید،1989)، ص67

[lxv] ساسی سالم الحاج، نقد الخطاب الاستشراقي، جلد1 (بیروت: دار المدار الإسلامي،2001)، ص89

[lxvi] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد1 (بیروت: دار الکتب العلمیہ،2001)، ص78

[lxvii] ڈاکٹر محمد علی، ڈیجیٹل ریسرچ میتھڈز،(کراچی: سائنٹیفک پبلیکیشنز،2020)، ص112

[lxviii] پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، ڈیجیٹل اسلامک لائبریریز،(اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،2019)، ص67

[lxix] پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی، اسلامی علوم میں تحقیقی مناہج،(اسلام آباد: شریعہ اکیڈمی،2005)، ص89

[lxx] ڈاکٹر طاہر القادری، جدید تحقیقی مناہج،(لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز،2018)، ص134

[lxxi] ڈاکٹر محمد اجمل، تحقیقی معیارات کا بحران،(لاہور: علمی پبلیکیشنز،2021)، ص45

[lxxii] ڈاکٹر طاہر القادری، تحقیق کے جدید تقاضے،(لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز،2022)، ص78

[lxxiii] ڈاکٹر محمود احمد غازی، موضوعاتی تحقیق کی اہمیت،(اسلام آباد: شریعہ اکیڈمی،2019)، ص112

[lxxiv] پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، تحقیقی رجحانات،(اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،2020)، ص67

[lxxv] پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، عالمی تحقیقی معیارات،(اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،2020)، ص67

[lxxvi] ڈاکٹر محمد اجمل، تحقیقی تقاضے اور عالمی معیارات،(کراچی: اردو اکادمی،2019)، ص134